قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تمدنی جھلکیاں

جناب شبیر احمد خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی
سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی (اتر پردیش)

اعتذار: سنہ ۱۹۵۴ء میں مدراس یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی دعوت پر محترم المقام جناب ڈاکٹر یوسف سین خاں صاحب سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے جو اُس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اندر شعبۂ تاریخ کے پروفیسر تھے، عثمان محمد اسمٰعیل۔ عثمان عبدالحق انڈاومنٹ ے زیر سرپرستی "ہندوستانی اسلامی ثقافت" کے موضوع پر پانچ توسیعی لیکچر دئے تھے۔ یوں یہ خطبات سب کے سب اپنے مصنف کے وسعت مطالعہ، مبصرانہ نظر اور استادانہ تحقیق وش کے آئینہ دار ہیں لیکن چونکہ مترجم اسلام کی ثقافتی سرگرمیوں کا عموماً اور قرونِ وسطیٰ کے ندوستان کی علمی تاریخ کا خصوصاً طالب علم رہا ہے، اس لیے اس کی دلی خواہش ہے کہ اردو ب کی ثروت بھی ان بصیرت افروز خطبوں میں سے کم از کم تیسرے خطبہ کی ثروت سے جو مسلم ندوستان کی علمی تاریخ پر مشتمل ہے، تہی دامن نہ رہے اگرچہ اسے اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں ری طرح شعور ہے کہ نہ تو اظہار مافی الضمیر پر وہ قدرت ہے جو اس قسم کے "ماقل و دل" نکات لیہ کے ترجمے کے لیے شرط اولین ہے اور نہ موضوع زیر نظر کا وہ مطالعہ ہی ہے جو تحقیق و کاوش اُن گوشوں تک پہونچنے میں اعانت کر سکے، جہاں مصنف علام کو اُن کے وسعت مطالعہ یعنی بصیرت اور حکیمانہ نظر نے پہونچایا ہے، بایں ہمہ ایک کوشش ناتمام اس امید پر کی

جاری ہے کہ شاید اور کوئی

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

پیش لفظ

قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان درحقیقت "مسلم ہندوستان" تھا۔ اگرچہ حکمران طبقہ اکثر حالات میں نو واردوں ہی پر مشتمل تھا، لیکن ہندوستانی سلطنت کسی بیرونی حکومت کی نو آبادی نہیں تھی بلکہ ایک مستقل اور آزاد حکومت تھی۔ اس صورتِ حال کی پیدائش میں کچھ تو بین الاقوامی واقعات کو دخل تھا، جہاں تاتاری غارت گروں نے خود عراق (بغداد) کو جس کی نام نہاد بالادستی تیرھویں صدی مسیحی کے وسط تک دیگر اسلامی ممالک کے اندر مذہبی تقدس کی حیثیت رکھتی تھی، فتح کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا، اور کچھ اس حریت پسندی کی کارفرمائی تھی جس کی نو واردوں کو اسلام نے بنیادی طور پر تعلیم دی تھی۔

غرض جلد ہی یہ خطہ اسلامی ثقافت کا مرکز بننے لگا اور تیرھویں صدی مسیحی کے آخر میں تو دہلی اور قاہرہ ہی اسلام اور اسلامیات کا گہوارہ بن گئے۔

لیکن قرونِ وسطیٰ میں جو ثقافتی نظام اس ملک میں رائج تھا، وہ عراق اور خراسان ہی سے ماخوذ تھا (جو اپنی نوبت میں حجاز کے نئے معاشرتی انداز پر تعمیر ہوا تھا جس کی بنیاد پیغمبرِ اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی)۔ نو واردوں نے یہاں کے قدیم ثقافتی نظام کی خوش دلی نہیں کی۔ اس کی وجہ نہ تو اُن کی ثقافت بیزاری تھی اور نہ ثقافتی تنگ نظری۔ بلکہ خود عہدِ قدیم کا یہ فرسودہ نظام بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے قاصر تھا، کیونکہ کائنات کے رئیس اعظم (انسان) کی اپنے ہمسروں (شجر و حجر) کے آگے جبہ سائی (مورتی پوجا)، انسان کے لیے انسان کی پرستش (بادشاہ پرستی)، آدم کی ایک ہی اولاد میں اونچ اور نیچ کا امتیاز (جات پات)، اقتصادی دستبرد کی مملکت کی جانب سے حوصلہ افزائی اور زندگی کی دوسری نعمتوں کے ساتھ سب سے بڑی نعمت (علم) سے

معاشرہ کی اکثریت کی قانونی محرومی (جس کی رو سے عورت اور شودر کے لیے علم و حکمت کا حصول ممنوع تھا) تاریخ کے عہد نو کے لیے، جس کا افتتاح ان نو واردوں کی آمد سے ہوا تھا، بیش از خواب پریشاں نہ تھے۔ لہذا نو واردوں نے بھی بزور و جبر اس کی اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ بقائے اصلح کے اصول کے ماتحت ان مفاسد کا خاتمہ یقینی تھا۔

اس ثقافتی مسابقت کا نتیجہ ظاہر تھا۔ زندگی کے ترقی پذیر رجحانات کے لیے نئے ثقافتی نظام کو لبیک کہنا فطری تھا اور جلد ہی یہ ملک قبۃ الاسلام بن گیا۔

لیکن بعد میں حکمراں طبقہ نے اپنی باطل خواجگی کے تحفظ کے لیے خود اس نئے دین کی نشر و اشاعت ں روڑے اٹکائے۔ شروع میں اس کی غلط تبلیغ سے (جو اس کے مغز و روح کے بجائے اس کے رست اور قشر کی تبلیغ و اشاعت کا نام تھی) اور بعد میں علانیہ اس کی ممانعت؛ بلکہ خود مفتوح اقوام کی ل بند وال ثقافت کی روح کو اپنے چند روزہ اقتدار باطل کی بقا کے لیے اختیار کر کے اس میں حیات زہ پھونک دی۔ چنانچہ موروثی پیمانے توہم پرستی کی، بادشاہ پرستی نے ظل سبحانی کے تصور کی، ذات پات نے اشراف و اجلاف کے امتیاز کی اور حصول علم میں معاشرتی پابندیوں نے کچھ بحثی اور علمی جمود کی شکل تیار کر لی۔ اس طرح خود نئی ثقافت کے امینوں ہی نے چند روزہ اغراض کی خاطر اس کے ساتھ خیانت اور نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

بہر حال قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی ثقافت، بالخصوص یہاں کا تعلیمی نظام حجاز و عراق سے وذ تھے اور اس لیے انہیں ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے حجاز و عراق کے ثقافتی و تعلیمی نظام پر صنف علام نے ایک طائرانہ نگاہ کے ساتھ اس بصیرت افروز خطبہ کا افتتاح فرمایا ہے۔

(۱) مسلم ہندوستان کے تعلیمی نظام کا پس منظر

ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں نے تعلیمی نظام کو مکمل کر لیا تھا، جو ان کی عبقریت کے

چنانچہ اسلام نے اقدار حیات کا جو نقشہ اپنے متبعین کے سامنے رکھا ہے اس میں علم و حکمت ہی کو زندگی کی سر اصلی "خیر کثیر" قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔۔۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جاری ہے کہ شاید اور کوئی

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب

پیش لفظ

قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان درحقیقت "مسلم ہندوستان" تھا۔ اگرچہ حکمران طبقہ اکثر حالات میں نوواردوں ہی پر مشتمل تھا، لیکن ہندوستانی سلطنت کسی بیرونی حکومت کی نوآبادی نہیں تھی، بلکہ ایک مستقل اور آزاد حکومت تھی۔ اس صورت حال کی پیدائش میں کچھ تو بین الاقوامی واقعات کو دخل تھا، جہاں تاتاری غارت گروں نے خود عراق (بغداد) کو جس کی نام نہاد بالادستی تیرھویں صدی مسیحی کے وسط تک دیگر اسلامی ممالک کے اندر مذہبی تقدس کی حیثیت رکھتی تھی، فتح کر کے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا، اور کچھ اُس حریت پسندی کی کارفرمائی تھی، جس کی نوواردوں کو اسلام نے بنیادی طور پر تعلیم دی تھی۔

غرض جلد ہی یہ خطہ اسلامی ثقافت کا مرکز بننے لگا اور تیرھویں صدی مسیحی کے آخر میں تو دہلی اور قاہرہ ہی اسلام اور اسلامیات کا گہوارہ بن گئے۔

لیکن قرونِ وسطیٰ میں جو ثقافتی نظام اس ملک میں رائج تھا، وہ عراق اور خراسان ہی سے ماخوذ تھا (جو اپنی نوبت میں حجاز کے نئے معاشرتی انداز پر تعمیر ہوا تھا، جس کی بنیاد پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی)۔ نوواردوں نے یہاں کے قدیم ثقافتی نظام کی خوشہ چینی نہیں کی۔ اس کی وجہ نہ تو اُن کی ثقافت بیزاری تھی اور نہ ثقافتی تنگ نظری۔ بلکہ خود عہدِ قدیم کا یہ فرسودہ نظام بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دینے سے قاصر تھا، کیونکہ کائنات کے رئیس اعظم (انسان) کی اپنے ہی ہمسروں (شجر و حجر) کے آگے جبہ سائی (مورتی پوجا)، انسان کے لیے انسان کی پرستش (بادشاہ پرستی)، آدم کی ایک ہی اولاد میں اونچ اور نیچ کا امتیاز (جات پات)، اقتصادی دستبرد کی مملکت کی جانب سے حوصلہ افزائی اور زندگی کی دوسری نعمتوں کے ساتھ سب سے بڑی نعمت (علم) سے

معاشرہ کی اکثریت کی قانونی محرومی (جس کی رو سے عورت اور شودر کے لیے علم و حکمت کا حصول ممنوع تھا) تاریخ کے عہد نو کے لیے، جس کا افتتاح ان نوواردوں کی آمد سے ہوا تھا، بیش از خواب پریشاں نہ تھے۔ لہٰذا نوواردوں نے کبھی بزور جبر اس کی اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ "بقائے اصلح" کے اصول کے ماتحت ان مفاسد کا خاتمہ یقینی تھا۔

اس ثقافتی مسابقت کا نتیجہ ظاہر تھا۔ زندگی کے ترقی پذیر رجحانات کے لیے نئے ثقافتی نظام کو لبیک کہنا فطری تھا اور جلد ہی یہ ملک قبۃ الاسلام بن گیا۔

لیکن بعد میں حکمراں طبقہ نے اپنی باطل خواجگی کے تحفظ کے لیے خود اس نئے دین کی نشر و اشاعت میں روڑے اٹکائے شروع میں اس کی غلط تبلیغ سے (جو اس کے مغز و روح کے بجائے اس کے پوست اور قشر کی تبلیغ و اشاعت کا نام تھی) اور بعد میں علانیہ اس کی ممانعت، بلکہ خود مفتوح اقوام کی ائل بزوال ثقافت کی روح کو اپنے چند روزہ اقتدار باطل کی بقا کے لیے اختیار کر کے اس میں حیات تازہ پھونک دی۔ چنانچہ دورتی پھلنے تو ہم پرستی کی، بادشاہ پرستی نے ظل سبحانی کے تصور کی، جات پات نے اشراف و اجلاف کے امتیاز کی اور حصول علم میں معاشرتی پابندیوں نے کج بحثی اور علمی جمود کی شکل اختیار کرلی۔ اس طرح خود نئی ثقافت کے امینوں ہی نے چند روزہ اغراض کی خاطر اس کے ساتھ خیانت کی اور نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔

بہرحال قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی ثقافت، بالخصوص یہاں کا تعلیمی نظام حجاز و عراق سے ماخوذ تھے اور اس لیے انہیں ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے حجاز و عراق کے ثقافتی و تعلیمی نظام پر مصنف علام نے ایک طائرانہ نگاہ کے ساتھ اس بصیرت افروز خطبہ کا افتتاح فرمایا ہے۔

(۱) مسلم ہندوستان کے تعلیمی نظام کا پس منظر

ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں نے تعلیمی نظام کو مکمل کر لیا تھا[۱] جو ان کی عبقریت کے

---

[۱] چنانچہ اسلام نے اقدار حیات۔ کا جو نقشہ اپنے متبعین کے سامنے رکھا ہے، اس میں علم و حکمت ہی کو زندگی کی "قدر اعلیٰ" (خیر کثیر) قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مطابق تھا۔ گیارھویں صدی آتے آتے مسلم ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے جو مدارس کہلاتے تھے علم و حکمت کے مرکز بن گئے، جن میں مذہبی رجحان نمایاں تھا۔ یہ مدارس راسخ العقیدگی کے حصن حصین تھے اور انہیں حکومتی اعانت حاصل تھی۔ ضمنی طور پر بھی مدارس حکومت کے لیے قاضی، مفتی اور دوسرے منتظمین فراہم کرتے تھے۔ چونکہ قرون وسطیٰ کا انداز فکر مذہبی و دینیاتی تھا، لہٰذا سیاست ہو یا فلسفہ یا تعلیم سبھی اس کے تابع تھے اور انہیں فنی دینی مصطلحات کے مطابق بنایا جاتا تھا۔ (بظاہر) لوگوں کا انداز فکر دینیاتی تھا اور ان کا انداز گفتگو بھی مذہبی تھا لیکن اگر ہم اس رسمی اظہار خیال کے پس پردہ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کی تہ میں جو مقاصد اور امیدیں کارفرما تھیں، وہ اُن مقاصد اور اُمیدوں سے مختلف نہ تھیں جو ہم اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔

مدرسوں کے علاوہ جو اسلامی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے مرکز تھے، مکاتب بھی تھے ابتدائی اور ثانوی تعلیم دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدارس کی امداد یا تو حکومت کرتی تھی یا اہل خیر۔ لیکن

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)
"ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا" اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دی گئی
اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کو اپنے پیروؤں پر فرض مقرر کیا اور فرمایا "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" نیز آپ نے انہیں حکم دیا کہ اس متاعِ بے بہا کی تلاش میں "چین" (اقصائے عالم) تک کے سفر سے دریغ نہ کریں اور ارشاد فرمایا "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کیونکہ حکمت مرد مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے، جہاں ملے وہ اُس کے لے لینے کا حقدار ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف کی حدیث ہے، "کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن اینما وجدھا فھو احق بھا" (حکمت مرد مومن کی متاع گم گشتہ ہے جہاں ملے وہ اُس کے لے لینے کا زیادہ حقدار ہے) اسلام جب عرب میں مبعوث ہوا، تو اس وقت پورے ملک میں صرف سترہ آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ مگر یہ اسلام ہی کا کارنامہ ہے کہ اُس نے تحصیل علم کے ساتھ نوشت و خواند پر بھی زور دیا اور اللہ تعالیٰ کی یہ عظیم نعمت جسے اقوام قدیمہ نے صرف مخصوص طبقات ملک ہی کے لیے محدود کر رکھا تھا، اسلام کی برکت سے عام ہوگئی۔ جناب رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو تحریر و کتابت کی تعلیم سے جو دلچسپی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں جو قیدی گرفتار ہو کر آئے ان میں سے جو لوگ زرِ فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے، انہیں آپ نے حکم دیا کہ ہر شخص مدینہ منورہ کے دس بچوں کو نوشت و خواند سکھا دے۔ یہی اس کا فدیہ ہے۔
بعد کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ البتہ سامانی حکومت کی علمی سرپرستی اس بنا پر قابل ذکر ہے کہ اُسی کے کھنڈروں پر غزنوی سلطنت قائم ہوئی تھی۔ ثعالبی سامانی عہد کے بخارا کی علمی و ادبی عظمت کے بارے میں لکھتا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ)

ابتدائی تعلیم جو مکاتب میں دی جاتی تھی، صرف مقامی آبادی کی نجی کوششوں پر چھوڑ دی جاتی تھی عباسیوں کے زمانے میں ایران اور وسط ایشیا کے تمام بڑے شہر اپنے تعلیمی اداروں کی شوکت و عظمت کی بنا پر بغداد سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ ادارے یا تو شاہی خاندان کے افراد نے قائم کئے تھے، یا عوام کے خیر و خیرات سے۔ انہیں اداروں کے ذریعہ ثقافتی ترقی اور تحقیقات علمیہ کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔

(۲) غزنوی اور غوری عہد حکومت

سلطان محمود نے غزنین میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے اخراجات کے لیے بہت بڑا وقف جاری کیا۔[۱] اس مدرسہ میں وسط ایشیا اور ایران سے طلبار کھنچے چلے آتے تھے۔ محمود کو

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ)

"سامانی خاندان کے عہد حکومت میں بخارا بزرگی کا گہوارہ، ملک کا مرکز، منتخب روزگار لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ، روئے زمین کے ادبار کا مطلع النجوم اور فضلائے دہر کا بازار تھا۔" (یتیمۃ الدہر جلد رابع صفحہ ۴۳)

اسی طرح بشاری مقدسی جو ۳۷۵ھ کے قریب ماورار النہر پہونچا تھا، سامانیوں کی علم نوازی و علمار پروری کے بارے میں لکھتا ہے:-

"سامانی حکمرانوں کا دستور ہے کہ وہ علمار کو زمین بوسی کی تکلیف نہیں دیتے۔ ماہ رمضان کی جمعراتوں میں عشار کی نماز کے بعد مجالس مناظرہ قائم کرتے ہیں۔ پہلے بادشاہ کوئی مسئلہ دریافت کرتا ہے پھر علمار اس میں بحث کرتے ہیں ...... بخارا میں جو شخص سب سے زیادہ فقہ کا عالم ہوتا ہے اُس کو منتخب کرکے اس کا تقرر کرتے ہیں، اُسی کی رائے پر عمل کرتے ہیں ..... اور اسی کے مشورے سے اعلیٰ عہدوں پر لوگوں کا تقرر کرتے ہیں۔" (احسن التقاسیم صفحہ ۳۳۹)

[۱] فرشتہ لکھتا ہے:-

"سلطان چوں بفتح و فیروزی از یں سفر مراجعت نمود، فرمود تا در غزنین مسجد جامع بنیاد نہادند..... و در جوار آں مسجد، مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ، و بات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۸)

غالباً فرشتہ کا ماخذ "روضۃ الصفا" ہے جہاں میر خوند نے لکھا ہے کہ جب سلطان قنوج وغیرہ بلاد ہندوستان کی فتح سے فارغ ہوکر غزنی پہونچا تو اُس نے یہ مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا۔

"سلطان چوں از بلاد ہندوستان باز گشت جامع بزرگ در میان غزنین بنیاد نہاد (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

علم و ادب کی سرپرستی سے بڑی دلچسپی تھی[۱] اس کے دربار میں البیرونی، فردوسی، عتبی اور بہت سے دیگر علماء کے مفکرین و شعرائے متعلقین جمع رہتے تھے۔ اس کے مدرسہ سے متعلق جو کتب خانہ تھا، وہ اپنی نوعیت میں منفرد تھا۔[۲] جملہ علوم و فنون پر کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ اس میں موجود تھا۔ مشہور فلسفی عنصری اس مدرسہ کا صدر تھا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) .... و در جوار آں مسجد مدرسہ بنیاد نہاد و بنفائس کتب و غرائب نسخ از امور شرع و فنون گردانید و قریٰ و مستغلات بسیار بر آں وقف کرد۔" (روضۃ الصفا جلد چہارم صفحہ ۱۴۲)

بادشاہ وقت کی تقلید میں امراء و اعیان مملکت نے بھی اقطار ملک میں بے شمار مدارس و دیگر بقاع خیر تعمیر کرائے۔ چنانچہ فرشتہ اس طرح لکھتا ہے:

"چوں سلطان محمود را ذوق بہ بنائے مسجد و مدرسہ شد بمقتضائے الناس علیٰ دین ملوکہم ہر یکے از امراء و اعیان دولت بہ بنائے مسجد و مدارس و رباطات و خوانق مبادرت فرمودند۔ در اندک فرصت آں مقدار عمارات عالیہ باتمام رسید کہ از حیز شمار بیروں گشت۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] ابن الاثیر نے محمود کی علمی سرپرستی کے بارہ میں لکھا ہے۔

"وصنف له الكثير من الكتب في فنون العلم وقصده العلماء من اقطار البلاد وكان يكرمهم ويقبل عليهم ويعظمهم ويحسن اليهم۔" (کامل لابن الاثیر المجلد التاسع صفحہ ۱۳۹)

مختلف علوم میں بہت سی کتابیں اس کے نام پر معنون کی گئیں اور اطراف و جوانب سے علماء اس کے دربار میں آتے وہ بھی ان کی عزت کرتا تھا انہیں انعامات سے نوازتا تھا اور ہر طرح ان کے ساتھ احسان کرتا تھا۔

[۲] اس کتب خانہ کی تعمیر کے متعلق روضۃ الصفا اور تاریخ فرشتہ کی تصریحات اوپر گزر چکی ہیں۔ بعد میں بھی اس کی ثروت میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ رے کی فتح کے بعد مال غنیمت میں جو کتابیں ہاتھ لگیں، ان میں سے فلسفہ، نجوم اور اعتزال کی کتابیں تو محمود نے جلوا دیں۔ باقی سو اونٹوں پر لدوا کر غزنی کے کتب خانہ میں بھجوا دیں۔ ابن الاثیر نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

"واحرق كتب الفلاسفة ومذاهب الاعتزال والنجوم واخذ من الكتب ما سوى ذلك مائة حمل۔"

سلطان نے فلسفہ، اعتزال اور نجوم کی کتابیں جلا دیں اور ان کے علاوہ باقی سو اونٹوں کے بوجھ کے برابر کتابیں لے لیں۔

اسی طرح میر خواند نے "روضۃ الصفا" میں لکھا ہے۔

"گویند کہ در کتب خانہ بعد الدولہ کتب بسیار بود آنچہ مشتمل بود بر سخنان حکماء و اہل اعتزال بموجب فرمان سوختہ گشت و باقی را بغزنین ارسال نمودند۔"

اس کتب خانہ کی ثروت میں محمود کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہا کیونکہ محمود کے جانشین مسعود نے جب علاء الدولہ ابن کاکویہ پر فتح پائی اور مال غنیمت میں شیخ بو علی سینا کے اثاث البیت کے ساتھ اس کی کتابیں بھی ہاتھ لگیں جو فلسفہ و حکمت پر مشتمل تھیں تو یہ غزنی کے کتب خانہ ہی میں داخل ہوئیں جہاں وہ ۵۴۵ھ تک رہیں۔ (القسم الثانی صفحہ ...)

محمود کے بیٹے مسعود نے بھی باپ کی روایات کو برقرار رکھا اور بڑی فیاضی سے اہل علم

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کے بعد جب علاء الدین جہانسوز نے غزنی کو فتح کر کے آگ لگادی یہ کتب خانہ بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ ابو الحسن بن ابی الفواس نے "اخبار الدولۃ السلجوقیہ" (صفحہ ۶) میں لکھا ہے:۔

ثم سار العمید ابو سھل الحمدونی مع تاش فراش الی اصفہان مع جیوش .... فانہزم منہا الملک علاء الدولہ واغاروا علی خزائنہ وداره وکان شیخ الحکیم ابو علی بن سینا رحمہ اللہ وزیر الملک علاء الدولہ فاتما عسکر تاش فراش علی بیت کتب ابی علی ونقلوا اکثرہ تصانیفہ الی خزانۃ کتب غزنہ وکانت فیہا مجموعۃ الی ان احرمہا ملک الجبال الحسین بن الحسین۔

(اخبار الدولۃ السلجوقیہ صفحہ ۶)

پھر عمید لشکر ابوسہل حمدونی تاش فراش کے ہمراہ لشکر جرار لے کر اصفہان کو چلا .... اس لشکر سے علاؤ الدولہ ابن کاکویہ نے شکست کھائی۔ ابوسہل اور تاش فراش نے اس کے خزانوں اور مکان پر غارتگری کی شیخ بوعلی سینا علاؤ الدولہ کا وزیر تھا۔ لہذا تاش فراش کے لشکر نے شیخ بوعلی سینا کے کتب خانہ کو بھی لوٹا اور اس کی بہت سی کتابیں لوٹ کر غزنی کے کتب خانے لے گئے۔ وہاں وہ جمع رہیں یہاں تک کہ اس کتب خانہ کو غور کے بادشاہ حسین بن الحسین (علاء الدین جہانسوز) نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

اسی طرح ابن الاثیر "ذکر الحرب بین علاء الدولہ وعسکر خراسان" کے زیر عنوان لکھتا ہے:۔

"وکان ابو علی بن سینا فی خدمۃ علاء الدولہ فاخذت کتبہ وحملت الی غزنہ فجعلت فی خزائن کتبہا الی ان احرقتہا عساکر الحسین بن الحسین الغوری" (کامل جلد نہم ص ـــــ)

ابو شیخ بوعلی سینا علاء الدولہ ابن کاکویہ کی خدمت میں موجود تھا پس اس کی کتابیں بھی لوٹ لی گئیں اور غزنی لے جائی گئیں جہاں شاہی کتب خانہ میں داخل کر دی گئیں۔ وہ وہاں رہیں تا آنکہ انہیں علاء الدین حسین جہانسوز کے لشکر نے جلا دیا۔

مال غنیمت کے علاوہ ویسے بھی فلسفہ وحکمت کی نادر کتابیں اس کتب خانہ میں داخل کی جاتی تھیں چنانچہ شیخ بوعلی سینا کی "الحکمۃ المشرقیہ" (جو اب دنیا سے بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے) اور "الحکمۃ العرشیہ" کے واحد نسخے غزنی ہی کے کتب خانہ میں تھے مگر انہیں بھی ۵۵۵ھ میں علاء الدین جہانسوز کے لشکر نے غزنی کے ساتھ ہی جلا ڈالا۔ چنانچہ ابو الحسن البیہقی "تتمہ صوان الحکمۃ" کے اندر شیخ بوعلی سینا کے تذکرے میں لکھتا ہے۔

"واما الحکمۃ المشرقیہ بتمامہا والحکمۃ العرشیہ فقال الامام اسماعیل الباخرزی انہما فی بیوت کتب السلطان مسعود بن محمود بغزنہ۔

رہی حکمت مشرقیہ (مکمل) اور حکمت عرشیہ تو امام اسماعیل باخرزی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ وہ سلطان مسعود بن محمود کے غزنی کے کتب خانہ میں موجود تھیں یہاں تک کہ بادشاہ غور علاء الدین

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کی سرپرستی کی۔[1] اُسی کے عہد حکومت میں البیرونی نے "قانون مسعودی" کو مکمل کیا جو قرون وسطیٰ کی علم الہئیت اور جغرافیہ پر سب سے بیش قیمت تصنیف ہے۔

غزنوی خاندان کے متاخر حکمرانوں نے اپنا پایۂ تخت غزنی سے لاہور میں منتقل کردیا[2]، جو بارھویں

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

حتی احرقھا ملک الجبال الحسین وعسکر الغور والغز فی شہور سنۃ ست واربعین وخمس مائۃ۔

حسین جہانسوز اور غوریوں اور غزوں کے لشکر نے انھیں ۵۴۶ھ میں جلا دیا۔ (تتمہ صوان الحکمۃ ص۱۵۶)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابن الاثیر نے مسعود کی علمی سرپرستی کے بارے میں لکھا ہے:۔

"کان السلطان مسعود شجاعاً کریماً ذا فضائل کثیرۃ محباً للعلماء کثیر الاحسان والتقرب لھم صنفوا لہ التصانیف الکثیرۃ فی فنون العلوم"

(کامل لابن الاثیر المجلد التاسع صفحہ ۱۶۸)

سلطان مسعود بہادر اور سخی تھا بہت سے اوصاف حمیدہ سے متصف تھا۔ علماء سے محبت رکھتا تھا اور ان پر بہت زیادہ احسان کرتا تھا اور اپنے تقرب سے نوازتا تھا۔ انہوں نے مختلف علوم میں بہت سی کتابیں اُس کے نام پر معنون کیں۔

اسی طرح "روضۃ الصفا" میں اس کی سیرت کے ضمن میں لکھا ہے۔

"سلطان مسعود پادشاہے شجاع وکریم الاخلاق بود وسخاوت مفرط داشت و با علماء وفضلاء مجالست نموده درباره ایشاں انواع احسان وامتنان بتقدیم رسانیدے جمع افاضل باسم او کتب نوشتہ اند...... ودر ممالک محروسہ آں شہریار بقاع خیر از مساجد ومدارس وغیر ذلک بحیثیتے بنا نہادند کہ زبان از تعداد آں قاصر است۔"

"روضۃ الصفا" کے اتباع میں فرشتہ نے بھی لکھا ہے:۔

"او پادشاہے بود شجاع وکریم الاخلاق، سخاوت بافراط داشت علماء وفضلاء مجالست نمودے ودرباره ایشاں انواع احسان وانعام مبذول داشتے۔ جمعے کثیر از فضلاء باسم او کتب نوشتند۔ از آنجملہ استاد ابوریحان خوارزمی منجم کہ علامہ وقت بود ودر فن ریاضیات نظیرے نداشت قانون مسعودی در علم ریاضی بنام نامی او نوشت ودر فیلہ از نقرہ صلہ یافت۔ وقاضی ابو محمد ناصحی نیز کتاب مسعودی در فقہ مذہب ابوحنیفہ بنام آں شاہ افاضل پناہ تالیف نمود...... ودر بلاد ائل سلطنت او در ممالک محروسہ چنداں مدارس ومساجد بنیاد نہادند کہ زبان بیان از تعداد آں عاجز وقاصر است۔" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [2] غالباً یہ واقعہ آخری غزنوی تاجدار خسرو ملک کے باپ اور پیش رو خسرو شاہ کے عہد حکومت کے اندر ۵۵۵ھ میں پیش آیا، کیونکہ بقول منہاج سراج محمد غوری نے غزنی کو ۵۶۹ھ میں غزوں سے چھینا تھا۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

LIBRARY

صدی میں بھی یہی اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

غوریوں کی فتوحات کے بعد سیاسی اقتدار کا مرکز لاہور سے دہلی میں منتقل ہوگیا[1]۔ اس طرح تیرھویں صدی کا وسط آتے آتے، دنیائے اسلام کا تمام علمی و ثقافتی سرمایہ ہندوستان میں پہنچ گیا اور دہلی مشرق میں اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز بن گئی جو تعلیمی نظام غزنی میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا تھا، وہی دہلی میں اختیار کیا گیا اور وہیں سے یہ پورے ملک میں پھیلا۔ حسن نظامی نیشاپوری "تاج المآثر" میں لکھتا ہے کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں بہت سے مدرسے قائم کیے[2] جو ہندوستان کے اندر اپنی نوعیت کے اولین ادارے تھے۔

(۳) عہد ممالیک

التتمش جس نے صحیح معنوں میں سلطنت دہلی کو مستحکم کیا[3] حکومتی ذمہ داریوں کے باوجود علماء و

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) "چوں سلطان معز الدین ملک تکنیا بادفی، لشکر غز و اُمرائے آں جماعت از پیش لشکر خطا ہزیمت شدہ بطرف غزنین آمدہ بودند و مملکت غزنین مدت دراز دو سال از دست خسرو شاہ ملک بیروں کردہ و در ضبط آوردہ سلطان معز الدین از تکینا باد بطرف غزنین دوام می تاخت و بر غزنی زد و آں بلاد از حمت می داد تا در شہور تسع وستین وخمس مائہ غزنیں را سلطان غیاث الدین فتح کرد۔" طبقات ناصری صفحہ ۱۱۵)

اس طرح غزنیں غزوں کے قبضہ میں ۵۴۸ھ میں آیا تھا اور یہ خسرو شاہ کا عہد حکومت تھا کیونکہ خسرو شاہ بہرام شاہ کی وفات کے بعد ۵۵۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ منہاج سراج نے لکھا ہے:۔

"سلطان یمین الدولہ والدین دبروا ہیتے تاج الدولہ والدین خسرو شاہ در سنہ اثنتین وخمسین وخمس ماۃ بتخت نشست مدت ملک او ہفت سال بود۔" (طبقات ناصری صفحہ ۲۵)

منہاج سراج نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ خسرو شاہ غزوں کی چیرہ دستی کے بعد لاہور چلا آیا تھا "خسرو شاہ بلوہور بہندوستان آمدہ بود۔" (ایضاً صفحہ ۲۵)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اگرچہ دہلی کو قطب الدین نے ۵۸۸ھ میں فتح کرلیا تھا اور اپنی گورنری کے زمانہ میں ۵۹۲ھ کے اندر اسے اپنا صدر مقام بنا کر جامع مسجد وغیرہ تعمیر کرائی تھیں لیکن دہلی کو قبۃ الاسلام بننے کے لیے التتمش کے عہد کا انتظار تھا۔

[2] "و اگرچہ شہر و نواحی از حسن و لطافت از بار زینتے بے نہایت داشت ... بنور حضور شہریاری آراستہ تر گشت و ہمانیں وصول پادشاہی رونق و طراوت زیادت یافت و تماشیر صبح ہدایت از افق مراد پیدا آمد و قواعد بتکدہا نقص و خرابی پذیرفت و معابد اصنام دادندان بمساجد و مدارس بدل افتاد و احکام اسلام و رسوم شریعت شائع و مستمر شد۔" (تاج المآثر قلمی)

[3] التتمش ۶۰۷ھ میں قطب الدین ایبک اور اس کے جانشین آرام شاہ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مشائخ کی سرپرستی اور ہمت افزائی کے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا۔[1] قطب مینار کی تعمیر کا شرف اُسی کو پہونچتا ہے، جس کی سنگین شوکت اور خوش نما حسن تعمیر کی دنیا میں نظیر نہیں ہے اور آج بھی وہ اُس کے عزم عالی و حوصلہ مقصد کی یاد دلاتی ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے دہلی میں مدرسہ تعمیر کیا۔ اس کا نام اُس نے سلطان شہاب الدین محمد غوری کے نام پر "مدرسہ معزی" رکھا تھا، کیونکہ محمد غوری کا حقیقی نام معز الدین محمد غوری تھا۔ اسی نام کا ایک اور مدرسہ بدایوں کے اندر، جو شمالی ہندوستان میں اسلامی ثقافت کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا، قائم کیا گیا۔

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ پہلا تاجدار ہے جس نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ مگر شروع میں اُس کی حالت بڑی ڈانواں ڈول تھی پہلے تاج الدین یلدوز سے ملکی اقتدار کے لیے کشمکش رہی۔ یلدوز کے قضیہ سے فارغ ہونے کے بعد ناصر الدین قباچہ سے سندھ و ملتان کے لیے آویزش شروع ہوگئی جس میں بالآخر التتمش ہی کو کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد اُس نے دہلی کی تزئین و آرائش میں کوشش کی۔ عصامی نے فتوح السلاطین کے اندر قباچہ کے مقابلے کی تفصیل کے بعد دہلی کی تزئین و آرائش کا حال لکھا ہے

بدہلی چناں تخت گاہے بساخت   سپاہش ورا فضائے آں ملک تاخت
وزاں شہر یک رونقے شد پدید   بلے لذتے باشد اندر جدید
بسے سیداں صحیح النسب   رسیدند درے ز ملک عرب
بسے کاسبان خراساں زمیں   بسے نقشبنداں اقلیم چیں
بسے عالمان بخارا نژاد   بسے زاہد و عابد از ہر بلاد
ز ہر ملک ہر جنس خلعت گراں   ز ہر شہر ہر اصل سیمیں براں
بسے ناقداں جواہر شناس   جواہر فروشاں بروں از قیاس
حکیماں یوناں طبیبان روم   بسے اہل دانش ز ہر مرز و بوم
دراں شہر فرخندہ جمع آمدند   چو پروانہ بر نور شمع آمدند
یکے کعبہ ہفت اقلیم شد   دیارش ہمہ دار اسلیم شد

[1] منہاج سراج التتمش کی علمی سرپرستی کے بارے میں لکھتا ہے:۔

از اول عہد دولت و طلوع مملکت در استجماع علماء کبار و سادات و ملوک و امرا و صدور و کبرا زیادت از ہزار الف بذل فرمود و خلائق اطراف گیتی را بحضرت دہلی کہ دار الملک ہندوستان است و مرکز دائرہ اسلام و مہبط اوامر و نواہی شریعت و حوزہ دین محمدی و بیضہ ملت احمدی و قبۃ الاسلام مشارق گیتی صانہا اللہ عن الآفات و احضر با اقصادات جمع آورد۔ و ایں شہر بکثرت انعامات و شمول کرامات آں پادشاہ دیندار مجمع صدور آفاق گشت۔۔۔ غالب ظن آنست کہ ہرگز پادشاہے بحسن اعتقاد و آب دیدہ و تعظیم علما و مشائخ مثل او از مہد خلقت در قماط سلطنت نیامدہ۔
طبقات ناصری صفحہ ۱۷۶۔۱۷۶